قرآنی حروف

ادبی و بلاغی اعجاز کا نمونہ

عائشہ عبدالرحمٰن بنت الشاطی
ترجمہ و تلخیص: محمد رضی الاسلام ندوی

قرآن کریم کا اعجاز یہ ہے کہ اس کا ہر لفظ اور ہر حرف اپنی جگہ اتنا برمحل ہے کہ اگر اسے بدل کر دوسرا لفظ یا دوسرا حرف لے آیا جائے تو معنی میں بگاڑ آجائے یا اسلوب بیان کے حسن میں فرق آجائے۔ پورے قرآن میں ایک لفظ یا ایک حرف بھی ایسا نہیں جہاں اس کی جگہ کوئی دوسرا لفظ یا حرف لایا جا سکے۔ پیش نظر مقالہ میں مفرد و مرکب قرآنی حروف کی چند مثالیں پیش کی جائیں گی جن کی تاویل کر کے اہل لغت اور ماہرین بلاغت نے انھیں ان کی حقیقی صورت سے پھیرنے کی کوشش کی ہے تاکہ ان سے اعرابی صنعت کے تقاضے پورے کئے جا سکیں اور مروجہ قواعد بلاغت پر عمل کیا جا سکے۔ لیکن قرآنی مطالعہ کی روشنی میں حروف کی تبدیلی یا انھیں محذوف یا زائد ماننے کی کوئی بھی صورت قابل قبول نہیں معلوم ہوتی۔ یہ حروف کئی طرح کے ہیں:

۱۔ وہ حروف جنھیں زائد قرار دیا گیا ہے۔
۲۔ وہ حروف جنھیں محذوف کہا گیا ہے۔
۳۔ وہ حروف جن کا عمل باطل کر دیا گیا ہے۔
۴۔ وہ حروف جنکی تاویل دوسرے حروف سے کی گئی ہے۔

ذیل میں ان حروف کے سلسلہ میں اہل لغت اور ماہرین بلاغت کے خیالات پیش کئے جائیں گے اور قرآن کی روشنی میں ان کا حقیقی مفہوم سمجھنے کی کوشش کی جائے گی۔

۱۔ وہ حروف جنہیں زائد قرار دیا گیا ہے

قرآن کریم میں کچھ حروف ایسے ہیں جنہیں علمائے لغت نے زائد قرار دیا ہے۔ حالانکہ ہم تصور نہیں کر سکتے کہ قرآن کا کوئی بھی حرف زائد ہو اور اسے بغیر کسی فائدے کے لایا گیا ہو جن حروف کو زائد قرار دیا گیا ہے ان میں سے ایک ما اور لیس کی خبر پر آنے والی 'ب' ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ قلم آیت ۲:

"ما انت بنعمة ربك بمجنون"

عموماً اہل نحو اور مفسرین نے کہا ہے کہ 'ما' کی خبر پر آنے والی 'ب' زائد ہوتی ہے جس طرح کہ لیس کی خبر پر 'ب' زائد آتی ہے۔ 'زائد ہونے' سے ان کی مراد یہ نہیں ہے کہ وہ حرف بیکار اور لغو آیا ہے بلکہ ان کے نزدیک اس کی زیادتی سے تاکید کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ ابن ہشام نے خبر پر زائد آنے والی 'ب' کو پانچ دوسرے مقامات کے ساتھ بیان کیا ہے جہاں وہ حرف زائد کے طور پر بیان ہوتی ہے اور ان تمام مقامات کو ایک عام حکم کے تحت شمار کیا ہے اور وہ ہے زائد 'ب' سے حاصل ہونے والی تاکید [۱]

قرآن میں وارد 'ما' اور 'لیس' کی خبر کا استقراء کرنے سے ہمیں تقریباً تیئیس[۲۳] مقامات پر 'ب' (جس کو زائد کہا جاتا ہے) ما اور لیس کی ایسی خبر پر ملتی ہے جو مفرد اور صریح ہوتی ہے۔ جبکہ صرف تین آیتوں میں لیس کی خبر پر 'ب' نہیں آئی ہے۔ النساء ۹۴، ھود ۸، الرعد ۴۳ (ان کا ایک خاص سیاق ہے جس پر ہم آگے غور کریں گے)

اسی طرح 'ما' کی صریح مفرد خبر پر عموماً 'ب' آتی ہے۔ جسے زائد قرار دیا جاتا ہے۔ البتہ جہاں ما نافیہ کے بعد فعل 'کان' ہو۔ وہاں اس کی صریح مفرد خبر منصوب ہوتی ہے اور اس پر 'ب' نہیں آتی ہے۔ جیسے مندرجہ ذیل آیات میں:

وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ (البقرہ: ۱۶)

مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا (آل عمران: ۶۷)

فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَمَا كُنَّا غَائِبِينَ (الاعراف: ۷)

وَمَاكُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا (الکہف: ۵۱)

مزید دیکھئے آیات: البقرہ۔ ۱۹۶، الانعام ۲۴، ۱۴۴، الانفال۔ ۳۳، ۳۵، ۵۳، یونس۔ ۳۷، ۴۵، ۷۱، ھود۔ ۲۰، یوسف۔ ۷۳، ۸۱، ۱۱۱، الاسراء۔ ۱۵، ۲۰، کہف۔ ۲۸، مریم۔ ۴، ۲۸، ۶۴، الانبیاء۔ ۸، الشعراء۔ ۸، یٰس۔ ۲۸، القصص۔ ۴۵، ۵۹، الاحزاب۔ ۴، الاحقاف۔ ۹، الزخرف۔ ۱۳

یہ تو تھا ان مقامات کا بیان جہاں مانافیہ کے بعد 'کان' ہونے کی صورت میں اس کی خبر پر 'ب' نہیں آئی ہے۔ ماکان کے علاوہ دوسرے اسلوب میں قرآن کریم میں اکثر ما کی صریح خبر پر 'ب' آئی ہے۔ غالباً صرف دو آیتیں اس سے مستثنیٰ ہیں:

اَلَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَآئِهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ ۭ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓـىِٔيْ وَلَدْنَهُمْ (المجادلہ: ۲)

مَا هٰذَا بَشَرًا ۭ اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ (یوسف: ۳۱)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ یہ کہدینا آسان نہیں ہے کہ ما اور لیس کی خبر پر آنے والی 'ب' زائد ہوتی ہے۔ مفسرین کہتے ہیں کہ یہ 'ب' تاکید کیلئے زائد لائی جاتی ہے[۲] جب ہم 'ب' کے دوسرے نظائر کا مطالعہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ کہیں کہیں لیس کی خبر پر ب آتی ہے تو اس سے نفی کی تاکید نہیں ہوتی بلکہ اس کے برخلاف اس سے اثبات مراد ہوتا ہے مثلاً ارشاد باری: "اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ" (الزمر۔ ۳۶) اس آیت میں 'ب' سے نفی کی تاکید نہیں ہوتی ہے بلکہ اس کے برخلاف اثبات کا معنی نکل رہا ہے۔ ذیل میں ہم ان تمام آیات کا مطالعہ کریں گے جن میں ما اور لیس کی خبر پر 'ب' آئی ہے اور جن میں ان کی خبر پر 'ب' نہیں آئی ہے تاکہ دونوں کا تقابلی مطالعہ کر کے ہم یہ راز آشکارا کرنے کی کوشش کریں کہ 'ب' کہاں خبر پر آتی ہے اور کہاں نہیں آتی؟

پہلے ہم ان آیتوں کو بیان کریں گے جن میں 'ما' کے ساتھ 'کان' نہیں ہے۔ ان میں عموماً 'ما' کی خبر کے ساتھ 'ب' آتی ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (البقرہ: ۸)

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (البقرہ: ۷۴)

وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا ۚ وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيلٍ (الانعام: ۱۰۷)

مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَا أَنَا بِظَلَّامٍ لِلْعَبِيدِ (ق: ۲۹)

قَالُوا أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ ۖ وَمَا نَحْنُ بِتَأْوِيلِ الْأَحْلَامِ بِعٰلِمِينَ (یوسف: ۴۴)

مزید دیکھئے آیات: البقرہ ۸۵، ۹۶، ۱۰۲، ۱۴۰، ۱۴۴، ۱۴۹، ۷۴، آل عمران ۔ ۹۹ ۔ الانعام ۔ ۱۳۲ ۔ ۱۳۴، ہود ۲۹، ۸۳، ۱۲۳، یوسف ۔ ۱۷، ۱۰۳، النحل ۴۶ ۔ ۸۱، المومن ۵۶، ابراہیم ۔ ۲۲ ۔ الشعراء ۱۱۴، ۱۳۸، فاطر ۔ ۲۲، الطور ۔ ۲۹، الطارق ۱۴، الشوریٰ ۔ ۶، حٰم السجدہ ۔ ۴۶، الروم ۔ ۵۳، القلم ۔ ۲، التکویر ۲۲ ۔ ۲۴ ۔

صرف دو آیتیں اس قاعدہ سے مستثنیٰ ہیں کہ ان میں ما کی خبر پر 'ب' نہیں آئی ہے اور وہ ہیں:

مَا هُنَّ أُمَّهٰتِهِمْ (المجادلۃ: ۲)

مَا هٰذَا بَشَرًا (یوسف: ۳۱)

پھر کیا اس کے باوجود ہم اس 'ب' کو زائد کہیں گے یا صرف یہ کہنا کافی ہوگا کہ 'ب' کا اضافہ نفی کی تاکید کے لیے کیا گیا ہے؟ ان تمام آیات کا جن میں ما کی خبر پر 'ب' آئی ہے ۔ استقراء کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مقام انکار کا ہے اور 'ب' کے ذریعے نفی کی تاکید ہوتی ہے ۔ سورہ مجادلہ اور سورہ یوسف کی آیتوں میں اس کے لانے کی ضرورت اس لئے نہیں پیش آئی کہ ان کے بعد فقرہ "إِنْ أُمَّهٰتُهُمْ إِلَّا اللَّائِي وَلَدْنَهُمْ" اور "إِنْ هٰذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ" سے نفی کی تاکید کا فائدہ حاصل ہو گیا اسی طرح ماکان کی خبر پر بھی ب کی ضرورت اس لیے نہیں ہوتی کیونکہ اس اسلوب میں نفی سے انکار کے معنی پیدا ہو جاتے ہیں ۔

جہاں تک لیس کا تعلق ہے تو اس کی خبر پر ب آنے یا نہ آنے کے سلسلہ میں کچھ تفصیل ہے، اور خبریہ اور استفہامیہ جملوں میں اس کے استعمال میں فرق ہو جاتا ہے ۔ جہاں خبریہ جملوں میں لیس کے ذریعے نفی، انکار کے مقام پر ہو وہاں اس کی خبر کے ساتھ 'ب' آتی ہے جیسے مندرجہ ذیل آیات میں:

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيكُمْ وَأَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِلْعَبِيدِ (آل عمران: ۱۸۲)

قُلْ لَسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيلٍ (الانعام: ۶۶)

فَإِنْ يَكْفُرْ بِهَا هٰؤُلَاءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ (الانعام: ٨٩)

مزید دیکھئے آیات: البقرہ: ۲۶۷، المائدہ ۱۳۶، الانفال ۵۱، الحج ۱۰، حم السجدہ ۴۶، الحجر ۲۰، الانعام ۱۳۲، الاحقاف ۳۲، المجادلہ ۱۰۔

لیکن لیس کی خبر کے ساتھ 'ب'، اس وقت نہیں آئے گی جب جملہ خبریہ کے قائل کو اس بات پر یقین نہ ہو جسکی وہ نفی کر رہا ہے بلکہ وہ زبان سے تو اس کی نفی کر رہا ہو لیکن اس کے دل میں کوئی چیز ہو جو اسے انکار سے روک رہی ہو مثلاً سورہ رعد کی آیت ۴۳:

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ؕ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ

کافر اگرچہ بظاہر زبان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کر رہے تھے مگر خود ان کے دلوں میں شک و تردد موجود تھا۔

یا مقام خبر کی نفی سے قبل تحقیق کا تقاضہ کرتا ہو جیسے سورۂ نساء کی آیت ۹۴:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰۤى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ

اس آیت میں اہل ایمان کو حکم دیا گیا ہے کہ کسی کے ایمان کی نفی کرنے سے قبل تحقیق کر لیں۔

یا جملہ خبریہ کے بعد ایسا جملہ ہو جو اسے مستقبل سے ماضی میں منتقل کر دے جیسے سورۂ ہود کی آیت ۸:

وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰۤى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ ؕ اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۚ

قرآن کریم میں صرف یہی تین آیتیں ہیں جن میں لیس کی خبر کے ساتھ 'ب'، نہیں آئی ہے۔

یہ تفصیل تو ان خبریہ جملوں کے بارے میں تھی جن میں لیس آیا ہے۔ رہے استفہامیہ جملے تو ان میں علی العموم خبر کے ساتھ 'ب' آتی ہے اور نفی کے بجائے اثبات کا معنی ہو جاتا ہے۔ پورے قرآن میں ایک آیت بھی ایسی نہیں جس میں نفی یا تاکیدِ نفی کا احتمال ہو۔ ان میں اثبات کے معنی اس حد تک پائے جاتے ہیں کہ جس چیز کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے اس کے جواب کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی یا لفظ 'بلیٰ' سے اس کا جواب دیا جاتا ہے (جو کہ استفہامیہ انکاری کے جواب کے لیے خاص ہے) مثال کے طور پر درج ذیل آیات:

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۭ قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ۭ قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَا ۭ (الانعام: ۳۰)

وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۚ شَهِدْنَا (الاعراف: ۱۷۲)

اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّـحْيِۦ الْمَوْتٰى (القیامۃ: ۴۰)

مزید دیکھئے آیات: الانعام ۵۳، ہود ۸۱، العنکبوت ۱۰، یٰس ۸۱، الزمر ۳۶، ۳۷، الاحقاف ۳۴

ان تمام آیات میں نفی کے معنی ختم ہو کر اثبات کے معنی آگئے ہیں۔ تو کیا اثبات کے معنی اس لئے پیدا ہوئے ہیں کیونکہ استفہام اپنے معنی اصلی سے نکل گیا ہے جیسا کہ علمائے بلاغت کہتے ہیں؟ یہ طے ہے کہ یہ معنی استفہام سے پیدا ہوئے ہیں جس طرح کہ اس سے استرحام، تضرع، یا نفی، زجر اور وعید یا توقع اور انتظار یا دوسرے معانی پیدا ہوتے ہیں۔

ان تمام آیات میں خبر کے ساتھ 'ب' آئی ہے۔ اس سے یہ بات متعین ہو جاتی ہے کہ قرآن کی بیانی دلالت کی تعیین میں اس 'ب' کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہے۔ مثلاً اگر ہم کہیں: الیست غافلا عما حولك؟ الیس الصبح قریبا؟ تو اس میں احتمال رہے گا کہ استفہام اپنے اصلی معنی (یعنی معلومات حاصل کرنا) پر ہے یا اس سے توبیخ یا تنبیہ یا استہزاء، یا توقع و انتظار کے معانی حاصل ہوتے ہیں؟ لیکن ان میں سے کسی معنی کا احتمال ان آیات میں نہیں ہے۔ جن میں استفہام کے ساتھ لیس کی خبر پر 'ب' آئی ہے۔ بلکہ اس سے صرف اثبات کے معنی متعین ہو جاتے ہیں۔

یہ ہے اس 'ب' کا راز جس کے بارے میں علماء نحو کہتے ہیں کہ یہ زائد ہے جسے خبر پر تاکید کے لیے لایا گیا ہے۔ چنانچہ اس کا عمل باطل قرار دیتے ہوئے وہ خبر کو منصوب قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس زائد حرف جر کی وجہ سے خبر کی اصلی حرکت ظاہر نہیں ہو رہی ہے۔

بیان قرآنی میں ان تمام آیات کا جن میں ما و لیس کی خبر پر ب آئی ہے استقرار کرنے سے جو باتیں معلوم ہوئی ہیں ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱۔ وہ خبریہ جملے جن کے شروع میں ما کان ہو ان کی خبر پر ب نہیں آئے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس اسلوب کے ذریعے نفیٔ انکار کا فائدہ حاصل ہوتا ہے جس طرح کہ فعل "ما کان اللہ لیعذبھم" میں انکار کا فائدہ حاصل ہو رہا ہے۔

۲۔ خبریہ جملوں میں 'ما' یا 'لیس' ہو اور خبر پر 'ب' ہو تو اس سے انکار کا معنی حاصل ہوتا ہے۔ بیان قرآنی میں اس سیاق میں ما اور لیس کی خبر پر ہمیشہ 'ب' آتی ہے۔ سوائے اس صورت کے جب نفی کی ضرورت نہ ہو یا خبر میں شک کا احتمال ہو۔

۳۔ استفہامیہ جملوں میں لیس کی خبر پر ہمیشہ 'ب' آتی ہے اور اس صورت میں نفی کا معنی ختم ہو کر اثبات کا معنی پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرا کوئی معنی نہیں پایا جاتا۔

قرآن کریم کے بیان میں حرف 'ب' کا یہ راز آشکارا ہونے کے بعد اس کے زائد ہونے کی بات مناسب نہیں معلوم ہوتی۔ خواہ زیادتی سے علماء نحو کی مراد اس کا حشو اور فضول ہونا نہ ہو، بلکہ تاکید کے لئے استعمال ہونا ہو[۳] چنانچہ اس بات میں ذرا سا بھی شبہ نہیں کہ اگر ہم ان تمام مقامات کا جہاں نحویوں نے 'ب' کو زائد قرار دیا ہے۔ استقرار کریں تو اس سے اہم بیانی نکتے حاصل ہونگے۔

۲۔ وہ حروف جنہیں محذوف کیا گیا ہے

اسی طرح علمائے نحو نے قرآن کے بعض مقامات پر کچھ حروف کو محذوف مانا ہے اور انھیں محذوف مانتے ہوئے آیات کی تاویل کی ہے مثال کے طور پر مندرجہ ذیل آیات میں وہ حرف 'لا' کو مقدر مانتے ہیں۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ (یوسف: ۸۵)

يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (النساء: ۱۷۶)

وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ (البقرہ: ۱۸۴)

ان آیتوں میں حذف۔ لائے نافیہ کے حذف کے نحوی قاعدہ کے تحت ہوا ہے

'لا' نافیہ آیت 'تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ' میں :

علمائے نحو کہتے ہیں کہ قسم کے جواب میں حرف 'لا' حذف ہو جاتا ہے جب فعل منفی مضارع ہو۔ اس کے کچھ شواہد انھوں نے اشعار سے پیش کیے ہیں۔ البتہ قرآن کریم سے صرف سورۂ یوسف کی آیت ۸۵ "تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ" پیش کی ہے۔ وہ اس آیت میں حرف 'لا' محذوف مانتے ہیں یعنی تَاللّٰهِ لَا تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ [۴]

اس سلسلہ میں ہماری سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ جب ۔ بقول انکے ۔ حذف عام ہو تو سیاق حتمی طور پر محذوف کے ذکر سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اس لیے وہاں حرف کو مقدر ماننے پھر حذف کی تاویل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ جب سیاق سے، اس حرف کو ذکر کئے بغیر معنی مراد حاصل ہو جاتے ہیں تو اس کا ذکر کرنا فضول ہوا جس سے بلیغ کلام کو پاک ہونا چاہیئے چہ جائیکہ قرآن کے معجزانہ بیان کو۔ شاید انھوں نے حرف نفی محذوف کی تقدیر کے سلسلہ میں 'تفتأ' کو 'مازال' پر محمول کیا ہے جو کہ افعال استمراری میں سے ایک اہم فعل ہے لیکن انھوں نے یہ فراموش کر دیا کہ 'زال' فعل استمراری اسی وقت ہوتا ہے جب منفی ہو۔ لیکن اگر اس سے پہلے حرف نفی نہ ہو تو وہ تام ہوگا اور اس کے معنی زوال (بقاء کی ضد) ہوں گے ۔ تام کی حیثیت سے اس کا استعمال عربی زبان میں بکثرت ہے اور اس سے فعل، مصدر، اسم فاعل، اسم مفعول، اسم زمان، اسم مکان سب آتے ہیں۔ جبکہ فتی سے حرف نفی کے بغیر بھی استمرار کے معنی حاصل ہوتے ہیں اور جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ عربی زبان میں تام نہیں آتا ۔ اس سے صرف فعل ماضی اور فعل مضارع (فتی ' یفتأ) آتا ہے اور دونوں میں استمرار کے معنی پائے جاتے ہیں۔

'لا' آیت 'یبین اللہ لکم ان تضلوا' میں :

علمائے نحو کہتے ہیں کہ درج بالا آیت میں لا کا حذف جائز ہے ضروری نہیں۔ ابن ہشام نے 'المغنی' میں لکھا ہے "آیت "یُبَیّنُ اللہ لَکُمْ ان تضلوا" (النساء۔۱۷۶) میں 'لا' مقدر ہے۔ تقدیر ہے لئلا تضلوا" آگے لکھا ہے: "یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس آیت میں مضاف محذوف ہے یعنی کراھۃ ان تضلوا"[۵]

یہ آیت قوانین میراث کی آیتوں میں سے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کا سیاق کوئی محذوف ماننے سے بالکل بے نیاز ہے اس لیے کہ کسی کو بھی یہ وہم نہیں ہو سکتا کہ اس کے معنی ہوں گے یبیّن اللہ لکم لِتضلوا۔ بلکہ ہر ایک سمجھتا ہے کہ اس کے معنی ہیں انما یبیّن اللہ لکم ما تتقون بہ الضلال۔ اور جب سیاق سے، بغیر اس حرف کو ذکر کئے جسے محذوف مانا جاتا ہے معنی مراد حاصل ہو جاتا ہے تو بلا ضرورت اسے ذکر کرنا قرآن جیسے بیان عالی کے منافی ہے۔ اس لئے کہ

'لا' نافیہ آیت 'وعلی الذین یطیقونہ' میں :

علمائے نحو کے نزدیک حذف جائز ہونے کی ایک مثال احکام صیام میں افطار اور فدیہ کی آیت ہے "یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۙ اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِیْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ وَعَلَى الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَهٗ فِدْیَةٌ طَعَامُ مِسْكِیْنٍ ؕ" (البقرہ: ۱۸۳-۱۸۴)

اس آیت کی تاویل میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ منسوخ ہے۔ اس قول کو امام طبری نے آیت کی تفسیر میں بیان کردہ اقوال میں سب سے پہلے بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

"بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ حکم فرضیت صوم کے اولین مرحلے میں تھا۔ مقیمین میں جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے تھے ان میں سے جو چاہتا روزہ رکھتا اور جو چاہتا روزہ نہ رکھتا تھا اور فدیہ دے دیتا تھا اور ایک دن کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلاتا تھا۔ یہاں تک کہ یہ حکم منسوخ ہوگیا اور رخصت صرف مریض اور مسافر کے لئے رہ گئی [۶]

یہ لوگ ناسخ بعد کی آیت کو قرار دیتے ہیں :

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ ؕ وَمَنْ كَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (البقرہ-۱۸۵)

زمخشری نے بھی اس حکم کے منسوخ ہونے کے قول کی طرف اشارہ کیا ہے [۷] ابوحیان نے اس کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے :

"یہی اکثر مفسرین کا قول ہے" [۸]

البتہ طبری نے نسخ کا قول ذکر کرنے کے بعد دوسرے لوگوں کا بھی قول نقل کیا ہے کہ :

"یہ حکم منسوخ نہیں ہوا ہے بلکہ آیت کا کوئی جز منسوخ نہیں ہے۔ اس کا حکم آیت کے وقتِ نزول سے تاقیامت باقی ہے" [۹]

ابن کثیر نے اختلاف سے احتراز کرتے ہوئے مفسرین کے اقوال بیان کرنے کے بعد لکھا ہے :

"حاصل یہ کہ نسخ صحتمند اور مقیم شخص کے حق میں ثابت ہے اس پر روزہ رکھنا

واجب ہے ارشاد باری ہے فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ رہا شیخ فانی جو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتا تو اس کے لئے روزہ نہ رکھنا جائز ہے اور اس پر قضا نہیں اس لئے کہ اب اس سے امید نہیں کہ کبھی اس کی ایسی حالت ہو سکے گی جب وہ اس کی قضا کر سکے گا"[10]

شری کو پس و پیش ہے کہ اس آیت کا حکم منسوخ ہے یا غیر منسوخ، غیر منسوخ ہونے کی صورت میں ان کے نزدیک الذین یطیقونہ سے مراد وہ لوگ ہوں گے جو تنگی اور پریشانی سے بدقت روزہ رکھ سکیں یعنی بوڑھے لوگ۔ روزہ نہ رکھنے اور فدیہ ادا کرنے کا حکم انھیں لوگوں کے لئے ہوگا[11]

عدم نسخ کے قائلین نے آیت کی تاویل میں مختلف آراء بیان کی ہیں:

"بعض لوگوں نے تصریح کی ہے کہ آیت میں 'لا' نافیہ محذوف ہے۔ انھوں نے آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباس کا قول بھی نقل کیا ہے لا رخصة الا للذی لا یطیق الصوم (رخصت صرف اس شخص کے لئے ہے جو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتا) حضرت عطا اس شخص کی تعیین کرتے ہیں جس کے لئے روزہ نہ رکھنا اور فدیہ ادا کرنا جائز ہے۔ کہتے ہیں: "وہ ضعیف شخص ہے جو کوشش کے باوجود روزہ رکھنے پر قادر نہ ہو لیکن وہ شخص کچھ مشقت سے روزہ رکھ سکتا ہو اسے روزہ رکھنا چاہیے روزہ ترک کرنے کی اسے رخصت نہیں"[12]

ابو حیان نے یہ ذکر کرنے کے بعد کہ نسخ کا قول اکثر مفسرین کا ہے، لکھا ہے:

"بعض مفسرین نے جائز قرار دیا ہے کہ آیت میں 'لا' محذوف ہو اس وقت فعل منفی ہو جائے گا اور تقدیر ہوگی وعلی الذین لا یطیقونہ" جیسے شاعر کا قول:

آلیت امدح مقرفا ابدا   یبقی المدیح ویذهب الرفد

(میں نے قسم کھالی ہے کہ مقرف کی کبھی مدح نہیں کروں گا اس لئے کہ مدح باقی رہ جاتی ہے اور عطیہ ختم ہو جاتا ہے)

یہاں لا محذوف ہے تقدیر ہے لا امدح

دوسرے شاعر کا قول ہے:

فخالف فلا واللہ تهبط تلعة　　من الارض الا انت للذل عارف

(مخالفت کرو، خدا کی قسم تم جس جگہ بھی جاؤ گے وہاں ذلت سے دوچار ہو گے)

اس شعر میں "لا" محذوف ہے تقدیر ہے لا تھبط

امراؤالقیس کا شعر ہے:

فقلت یمین اللہ ابرح قاعداً　　ولو قطعوا راسی لدیک واوصالی

(میں نے کہا خدا کی قسم میں یہیں بیٹھا رہوں گا خواہ وہ لوگ میرا سر قلم کردیں اور میرا جوڑ جوڑ کاٹ دیں) یہاں **"لا" محذوف ہے تقدیر ہے لا ابرح قاعداً**

پھر ابوحیان کہتے ہیں:

"آیت میں لا مقدر ماننا غلط ہے کیونکہ یہاں التباس کا اندیشہ ہے۔ آیت میں فعل کا مثبت ہونا متبادر الی الفہم ہے 'لا' کو محذوف ماننا صرف قسم میں جائز ہے جن اشعار سے استدلال کیا گیا ہے وہ سب قسم کے باب میں سے ہیں۔ قسم میں لا محذوف ماننے کی علت نحو میں مذکور ہے"[۱۳]

نحو میں قسم کے علاوہ دوسری صورتوں میں لا کو محذوف ماننا ممنوع نہیں ہے قاعدہ یہ ہے کہ جب فعل مضارع منفی ہو تو قسم کے ساتھ محذوف ماننا واجب ہے' اس کے علاوہ دوسری صورتوں میں جائز ہے' جیسا کہ ہم نے ابھی المغنی سے ابن ہشام کا کلام نقل کیا ہے۔

عدم نسخ کے قائلین میں سے بعض مفسرین "لا" محذوف نہیں مانتے لیکن انجام کار آیت کی تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ فعل مثبت ہونے کے باوجود حکم معطل ہو کر رہ جاتا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں:

"اور فدیہ دینا ان لوگوں کے لئے جائز ہے جو عالم شباب میں روزہ رکھنے پر قادر تھے مگر اب معذور ہو گئے ہیں ۔۔۔ اس طرح رخصت ان لوگوں کے لئے ثابت ہو گئی جو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے"[۱۴]

یا کہتے ہیں:

"جب رمضان آئے اور کسی شخص پر گزشتہ رمضان کے روزوں کی قضا ہو جنھیں وہ اس زمانے میں رکھ سکتا تھا مگر اس نے چھوڑ دیا تھا تو اس پر فدیہ ادا کرنا لازم ہے"۔[۵]

جب ہم زیر بحث آیات کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ دونوں آیتوں میں دو مختلف حالتوں کے بارے میں حکم دیا گیا ہے۔ فدیہ ان لوگوں پر ہے جو روزہ رکھ سکتے ہیں اور قضا ان لوگوں پر ہے جو مریض یا مسافر ہوں۔ قضا کی مشروعیت صرف اس شخص کے لئے ہے جسے کوئی عذر پیش آئے جس سے رمضان میں اس کے لئے روزہ نہ رکھنا جائز ہو جائے عذر ختم ہو جانے کے بعد اس پر قضا لازم ہے جتنے دن اس نے رمضان میں روزے نہیں رکھے تھے اتنے دنوں کی قضا کرے گا۔ اس صورت میں قضا کے بدلے فدیہ قابل قبول نہیں ہوگا۔

آیت میں جن لوگوں پر فدیہ واجب کیا گیا ہے ان کے لئے یطیقونہ کا لفظ آیا ہے پھر کیا ہم اسے لا یطیقونہ کے معنی میں لے لیں؟ ایسا مستبعد ہے۔ یہ آیت تشریع و احکام کی آیات میں سے ہے اور یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ قرآن مثبت الفاظ میں تعبیر کرے اور ہم اس کی تاویل نفی اور حذف سے کرنے لگیں۔ ابوحیان کے الفاظ میں: "لا کو مقدر ماننا غلط ہے۔ اس لئے کہ یہاں التباس کا اندیشہ ہے۔ آیت میں فعل کا مثبت ہونا متبادر الی الفہم ہے"۔ اگر فدیہ ان لوگوں پر عائد ہوتا جو طاقت نہیں رکھتے ہیں تو نص شرعی میں حرف نفی 'لا' ضرور موجود ہوتا۔ اور اس طرح اثبات اور نفی کی تاویل میں اختلاف کرنے کی گنجائش ہی نہ رہتی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس اختلاف کو حل کرنے کے لئے خود نص قرآنی سے رجوع کریں اور لفظ "یطیقونہ" میں غور کریں جس سے لفظ سے راز تک رسائی حاصل ہو سکے۔ یہ واضح ہے کہ جن لوگوں نے 'لا' کو بصراحت یا انجام کار محذوف مان کر آیت کی تاویل کی ہے انھوں نے یطیقونہ کو یستطیعونہ کے معنی میں لیا ہے حالانکہ دونوں کا ایک معنی نہیں ہے استطاعت کے لفظ میں حسن طاعت، موافقت اور قدرت کے معانی پائے جاتے ہیں اگر مسلمان میں روزہ رکھنے کی استطاعت ہے تو مشروعیت باقی ہے۔ اس وقت نہ فدیہ قابل قبول ہوگا نہ قضا، لیکن طاقت عربی زبان میں انتہائی منتفت

اور ازحد وقت کو کہتے ہیں۔ جب ایک شخص اپنے ساتھی سے کہتا ہے ھَل تطیق ھٰذا؟ (کیا تم اسے کرنے کی طاقت رکھتے ہو؟) تو اس وقت وہ یہ گمان کرتا ہے کہ یہ کام مشکل ہے جسے وہ شاید نہ کر سکے۔ لفظ کی اسی دلالت سے طاقت کو طبیعیات اور ریاضیات کی سائنسی اصطلاح ENERGY میں منتقل کر دیا گیا۔

ہم جب اس لفظ کے قرآنی استعمال کا استقراء کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ قرآن میں اس کا استعمال بحیثیت اسم و فعل تین مرتبہ ہوا ہے۔ ان تمام جگہوں پر اس کا سیاق "انتہائی مشقت اور ازحد قوت برداشت" کے معنی پر دلالت کرتا ہے۔ تینوں آیتیں سورۂ بقرہ کی ہیں:

قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ (آیت ۲۴۹)

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ (۲۸۶)

ان دونوں آیتوں کی روشنی میں ہم زیر بحث آیت کا مطلب سمجھ سکتے ہیں:

وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ (۱۸۴)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب روزہ ناقابل برداشت ہو تو انسان مکلف نہیں رہتا۔ اس لئے کہ شرع میں ناقابل برداشت چیز کا انسان کو مکلف نہیں قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کو اس کی طاقت کے بقدر ہی مکلف کرتا ہے۔ آیت میں فدیہ کا حکم ان لوگوں کے لئے نہیں ہے جو روزہ رکھ سکتے ہیں۔ اس لئے کہ استطاعت کی صورت میں انسان مکلف رہتا ہے۔ اس طرح فدیہ کا حکم ان لوگوں کے لئے بھی نہیں ہے جو روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہیں رکھتے اس لئے کہ جو شخص طاقت ہی نہیں رکھتا ہو وہ مکلف نہیں۔ فدیہ صرف ان لوگوں کی آسانی کے لیے ہے جو بادقت و مشقت روزہ رکھ سکتے ہوں۔ یعنی روزہ رکھنے سے ان کی طاقت ختم ہو جاتی ہو۔ قوت برداشت جواب دے جاتی ہو اور ان کی حالت ایسی بھی نہ ہو کہ وہ ان روزوں کی قضا دوسرے دنوں میں کر سکیں۔ یہاں ہمارے نزدیک ان لوگوں کا قول قابل قبول ہے جنھوں نے آیت کی تفسیر یہ کی ہے:

"اس سے مراد وہ مریض جسکے صحتیاب ہونے کی امید نہ ہو اور بوڑھا پیر فرتوت ہے۔ اس پر قضا بھی نہیں اس لیے کہ اب امید نہیں کہ کبھی اس کی حالت ایسی

ہو سکے گی جب وہ اس کی قضا کر سکے گا"[۱۶]

اسی طرح ہم زمخشری کا یہ قول قبول کرتے ہیں:

"الذین یطیقونہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو بدقت و مشقت روزہ رکھ سکتے ہوں اور وہ بوڑھے لوگ ہیں۔ ان لوگوں کے لئے روزہ نہ رکھنے اور فدیہ ادا کرنے کا حکم ہے۔ اس توجیہ کی صورت میں آیت کا حکم غیر منسوخ ہوگا"[۱۷]

یہ ان لوگوں کی آسانی کے لئے ہے جو دوسرے دنوں میں قضا نہیں کر سکتے۔ اس طرح آیت اپنے صریح نص پر باقی رہتی ہے "وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ" اور 'لا' نافیہ محذوف ماننے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

۳۔ وہ حروف جن کا عمل باطل کر دیا گیا ہے

اسی طرح کچھ حروف ایسے ہیں جن کا عمل، مفسرین کے آیتوں کی مخصوص تفسیر کرنے کی وجہ سے باطل ہو کر رہ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر درج ذیل آیت:

"لَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَنْ يُجَاهِدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ" (التوبہ - ۴۴)

اس آیت میں صراحت سے "لَا يَسْتَأْذِنُكَ" موجود ہے لیکن مفسرین آیت کی تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ "لا" کا عمل باطل ہو کر رہ جاتا ہے، طبری فرماتے ہیں:

"جو شخص اللہ پر ایمان لاتا ہے اس کی تصدیق کرتا ہے اور اس کی وحدانیت، حشر و نشر، آخرت اور ثواب و عقاب کا اقرار کرتا ہے وہ جہاد اور جان و مال سے اللہ کے دشمنوں سے جنگ نہ کرنے کی اجازت طلب نہیں کرے گا، ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ "اس سے منافقوں کو عار دلایا جا رہا ہے جنھوں نے کہ بلا کسی عذر کے جہاد نہ کرنے کی اجازت طلب کی تھی اور اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کا عذر قبول کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جہاد نہ کرنے کی اجازت طلب کرنے نہیں گئے"[۱۸]

نص قرآنی میں جب ہم براہ راست غور کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ آیت کو "پیچھے رہ جانے، جہاد نہ کرنے اور غزوہ فی سبیل اللہ ترک کر دینے کی اجازت نہ طلب کرنے" پر محمول کرنے سے مقام کی عظمت متاثر ہوتی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آیت کا مطلب صریح نص کے مطابق یہ سمجھا جائے کہ "اہل ایمان جہاد کرنے کی اجازت طلب نہیں کرتے ہیں" نہ کہ "اہل ایمان پیچھے رہ جانے اور جہاد نہ کرنے کی اجازت طلب نہیں کرتے ہیں" مومن کی شایان شان نہیں کہ فریضہ جہاد ادا کرنے کے لئے اجازت طلب کرے جس طرح کہ وہ نماز ادا کرنے، زکوٰۃ دینے، رمضان کے روزے رکھنے اور حج کرنے کے لئے اجازت طلب نہیں کرتا۔

سورہ توبہ کی یہ آیت غزوۂ تبوک کے موقع پر نازل ہوئی اس وقت جبکہ صحابہؓ جان و مال کے ساتھ اللہ کے راستے میں جہاد کیلئے نکل کھڑے ہوئے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد کیلئے نکلنے کی اجازت طلب کرنے کا کوئی موقع نہ تھا بلکہ ایسے موقع پر اجازت طلب کرنے کا مطلب تردد اور سستی ہوتا ہے جن لوگوں کو تردد ہوتا ہے وہی ایسے موقع پر شک اور حیرت کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کرتے ہیں کہ وہ جہاد کے لیے نکلیں یا نہ نکلیں۔ اگر حقیقت میں ان کا نکلنے کا ارادہ ہوتا تو وہ بغیر کسی تردد اور سستی کے تیاری میں لگے ہوتے اور اس انتظار میں ہوتے کہ کب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکلنے کا اعلان کریں اور وہ نکل کھڑے ہوں۔ یہ ہے وہ مفہوم جو صریح نص سے معلوم ہوتا ہے اس کا صریح سیاق بعد کی آیات کے ساتھ یہ ہے:

"اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ۝ وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ" (التوبہ: ۴۵-۴۶)

ان آیات کے ساتھ سورۂ توبہ کی آیت ۸۳ کا بھی مطالعہ کیجئے (جو منافقین کے بارے میں ہے جن کے دلوں میں شک ہے اور جو شک کی بنیاد پر تردد کرتے ہیں) تو ہمارا ابتلایا ہوا معنی متعین ہو جاتا ہے:

"فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا

مَعِيَ أَبَدًا وَلَن تُقَاتِلُوا مَعِيَ عَدُوًّا ۖ إِنَّكُمْ رَضِيتُم بِالْقُعُودِ أَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوا مَعَ الْخَالِفِينَ ﴿٨٣﴾ (التوبہ: ۸۳)

زمخشری کی تاویل سے بھی ہماری تائید ہوتی ہے۔ انھوں نے آیت زیر بحث کی جو تفسیر کی ہے اس سے 'لا' کا عمل باطل نہیں ہوتا۔ فرماتے ہیں:

"اہل ایمان کی عادت نہیں کہ وہ آپ سے جہاد کی اجازت طلب کریں، مخلص مہاجرین و انصار کہتے تھے کہ ہم نبی سے ہرگز اجازت طلب نہیں کرینگے۔ ہم اپنی جان اور مال سے ان کے ساتھ ضرور جہاد کریں گے"[۱۹]

۸۔ وہ حروف جنکی تاویل دوسرے حروف سے کی گئی ہے:

قرآن کریم میں کچھ ایسے حروف بھی ہیں جنھیں اہل تفسیر زائد قرار دیتے ہیں نہ محذوف۔ لیکن ان کے بارے میں اہل نحو کے ایک مسلک کو مانتے ہیں اور وہ یہ کہ "حروف جر کو ایک دوسرے کی جگہ لایا جاسکتا ہے اور ایک دوسرے کے قائم مقام کیا جاسکتا ہے۔۔۔" بقول ابن ہشام "اہل نحو میں یہ رائج ہے اور اس سے وہ استدلال کرتے ہیں"[۲۰] اس مسلک کا اہل لغت میں سے کچھ لوگوں نے رد کیا ہے جنھیں ابو ہلال عسکری نے محققین کہا ہے اور ابن درستویہ سے ان کا یہ قول نقل کیا ہے:

"دو حروف میں سے ایک کو دوسرے کی جگہ لانے سے لغت کی حقیقت باطل ہو جاتی ہے اور اس کی حکمت میں فساد واقع ہو جاتا ہے نیز یہ کہ ایسا ہونا عقل و قیاس کے بھی خلاف ہے"[۲۱]

ابو ہلال کہتے ہیں:

"اس لئے کہ حروف کو جب ایک دوسرے کی جگہ استعمال کیا جائے گا تو وہ اپنی حقیقتوں کے حدود سے تجاوز کر جائیں گے اور ہر ایک دوسرے کے معنی میں استعمال ہوگا۔ اس سے لازم آئے گا کہ دو مختلف الفاظ کا ایک معنی ہو اور محققین ایسا نہیں کہتے۔ ایسا تو وہ شخص کہہ سکتا ہے جو معانی سے ناواقف ہو"[۲۲]

ان لوگوں کے قول "بعض حروف جر ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے ہیں" پر تبصرہ کرتے ہوئے ابن ہشام نے لکھا ہے:

"ایسا کبھی کبھی ہوتا ہے۔ اگر یہ نہ کہا جائے گا تو استدلال مشکل ہو جاتے اس لئے کہ ہر وہ مقام جہاں وہ اس کا دعویٰ کریں وہاں ان سے کہا جائے گا کہ ہم تسلیم نہیں کرتے کہ یہاں نیابت واقع ہوئی ہے اگر ان کا یہ قول صحیح ہو جائے تو یہ کہنا بھی جائز ہو جائے گا مررت فی زید، دخلت من عمر، کتبت الی القلم

بصریین اور ان کا اتباع کرنے والے ان مقامات پر جہاں نیابت کا دعویٰ کیا جاتا ہے یہ سمجھتے ہیں کہ حرف اپنے حقیقی معنی پر باقی رہتا ہے"[۲۳]

اس سلسلے میں کچھ چھوٹ فعل میں ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ فعل میں اس قسم کی چھوٹ حرف کے مقابلہ میں زیادہ آسان ہے۔

اس اختلاف کا جب ہم قرآن کی روشنی میں جائزہ لیتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ قرآن کے کسی حرف کی تاویل کسی دوسرے حرف سے نہیں کی جا سکتی۔ قرآن کے ہر حرف کا استعمال اپنی جگہ برمحل ہوا ہے۔ اس سلسلہ کی چند مثالیں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں:

'فی' 'ل' کے معنی میں:

سورۂ توبہ کی آیت ہے: "فَهُمْ فِي رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُونَ" (۴۵)

اس آیت کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ یہاں 'فی' کی تاویل 'من' یا 'ل' سے کی جا سکتی ہے یعنی فهم من ریبهم یترددون" یا "فهم لریبهم یترددون"۔ حالانکہ دونوں میں سے کوئی حرف نص قرآنی میں استعمال شدہ حرف کی قائم مقامی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ آیت میں 'فی' سے مقصود تعلیل نہیں ہے جو حرف 'ل' سے مستفاد ہوتی ہے بلکہ اس سے مقصود "استغراق و ملابست" ہے جو 'فی' کی ظرفیت میں ملحوظ ہوتی ہے۔

'عن' 'فی' کے معنی میں:

اسی طرح کی ایک مثال سورۂ ماعون کی آیت میں حرف 'عن' ہے۔

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ (الماعون: ۴-۵)

یہاں ہم ان لوگوں کا قول مستبعد سمجھتے ہیں جو "سھون عن الصلوٰۃ" کی تاویل "سھون فی الصلوٰۃ" سے کرتے ہیں۔ اس لئے کہ نماز میں سہو کوئی ایسی خطا یا برائی نہیں ہے جس پر تباہی سنائی جائے ہر مومن اپنی نماز میں بھولتا ہے اور سجدۂ سہو کے ذریعے یا سنن و نوافل کے ذریعے اس کی تلافی کر لیتا ہے۔ جیسا کہ احکام عبادات میں "باب الصلاۃ" میں بیان کیا گیا ہے۔

اسی طرح ہم 'سھون عن الصلوٰۃ' کی اس تفسیر پر بھی مطمئن نہیں جس پر امام طبری نے اپنے اطمینان کا اظہار کیا ہے:

"میرے نزدیک اس کی تفسیر میں وارد تمام اقوال میں سب سے زیادہ قرین صواب یہ قول ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو نماز سے غفلت برتتے ہیں اور اسے چھوڑ کر دوسرے کاموں میں مشغول رہتے ہیں۔ اس طرح کبھی نماز ہی چھوڑ بیٹھتے ہیں اور کبھی وقت ختم ہو جانے کے بعد ادا کرتے ہیں۔ اس طور پر ان لوگوں کا قول صحیح قرار پاتا ہے جو کہتے ہیں کہ اس سے مراد نماز کے وقت کا خیال نہ رکھنا ہے اور ان لوگوں کا قول جو کہتے ہیں کہ اس سے مراد نماز ترک کرنا ہے"[۲۴]

ان دونوں تاویلوں سے ملتی جلتی تاویل وہ ہے جو زمخشری نے کی ہے:

"یا اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اس طرح نماز ادا نہیں کرتے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سلف نے ادا کی ہے۔ بلکہ بغیر خشوع و انابت کے جلدی جلدی ٹھونگیں مار لیتے ہیں اور داڑھی اور کپڑوں سے کھیلنے، جمائی لینے، اِدھر اُدھر دیکھنے اور دوسری مکروہات سے اجتناب نہیں کرتے۔ یہانتک کہ انھیں یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ کتنی رکعتیں ہوئیں اور کون کون سی سورتیں پڑھیں"[۲۵]

جب ہم اس آیت کو اس کے سیاق و سباق سے ملا کر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو حرف 'عن' کا راز آشکارا ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں ان نمازیوں کے لیے تباہی سنائی گئی ہے جو اپنی نمازوں سے بے پرواہ ہوتے ہیں جو نماز کو خالق کے سامنے کھڑا ہونا تصور نہیں کرتے کہ اس سے انسان کا عزور ٹوٹ جائے، وہ بری باتوں اور برے کاموں سے رک

جائے اور اپنے خالق کی جلالت وعظمت اور قدرت کے سامنے خشوع اور تواضع اختیار کرے اور اس کا ضمیر لرز جائے اور اس کے نتیجے میں وہ یتیم اور مسکین کے معاملہ میں اللہ سے ڈرے اور ان کا حق ادا کرتے ہوئے ان کے ساتھ حسن سلوک کرے۔

معلوم ہوا کہ سھون عن الصلاۃ سے مراد نہ نماز میں بھولنا ہے۔ نہ نماز کا ترک کرنا ہے اور نہ نماز کے وقت سے بے پرواہی برتنا ہے۔ نہ داڑھی اور کپڑا کھیلنا اور جمائی لینا ہے بعض لوگ نماز وقت پر ادا کرتے ہیں اور لوگوں کو دکھانے اور منفعت حاصل کرنے کیلئے خشوع اور انابت کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں مگر ان کا نمازیں حقیقی روح سے خالی ہوتی ہیں جو شخص یتیم کو جھڑکتا ہو اور مسکین کو کھانا کھلانے پر نہ اکساتا ہو اس کی نماز خشوع کرنے والے دل اور مومن ضمیر سے ادا نہیں ہو سکتی اور جب نماز بری باتوں اور برے کاموں سے نہ روک سکے تو یہی اس سے غفلت اور بے پرواہی ہے۔ اس صورت میں نماز محض ظاہری رسوم وعادات کی طرح ادا کی جاتی ہے اور اس سے مقصود محض دکھاوا ہوتا ہے۔

"ثم" فضیلت ومرتبہ میں تراخی کے معنی میں:

سورۂ بلد کی آیت ہے:

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ ۝ يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ أَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۝ (۱۱-۱۷)

اس آیت میں مفسرین نے حرف 'ثم' کے ذریعے (جو تراخی کے ساتھ ترتیب کا فائدہ دیتا ہے) 'فک رقبۃ' پر ایمان کے عطف ہونے کے بارے میں کافی غور وفکر کیا ہے اور اس کی ایسی تاویل کی ہے جو اسے اس کے صریح سیاق اور ظاہری مفہوم سے نکال دیتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس کا یہ مطلب نکالا ہے کہ ایمان ماقبل چیزوں سے بلند تر ہے۔ تراخی ترتیب میں نہیں بلکہ مرتبہ میں ہے۔ کہتے ہیں کہ یہاں 'ثم' لانے سے مقصود یہ بتلانا ہے کہ ایمان کا مرتبہ غلام آزاد کرنے اور یتیم ومسکین کو کھانا کھلانے سے بلند تر ہے۔ تاکہ دونوں ایک مرتبہ میں نہ ہو جائیں

زمخشری لکھتے ہیں:

"ثم کو ترتیب میں نہیں بلکہ فضیلت و مرتبہ میں تراخی کیلئے لایا گیا ہے اس لئے کہ ایمان دوسری تمام چیزوں سے مقدم ہوتا ہے کوئی عمل بغیر اس کے معتبر نہیں" [۲۶]

یہی ابوحیان کا بھی خیال ہے۔ کہتے ہیں:

"ثم" زمانہ میں تراخی کیلئے نہیں بلکہ فضیلت میں تراخی کیلئے آیا ہے۔ اس لیے کہ ایمان کا تمام اعمال حسنہ پر مقدم ہونا ضروری ہے۔ ایمان عمل کرنے والے کی طرف سے اس کے اعمال کی صحت کیلئے شرط ہے یا پھر آیت کا مطلب یہ ہے کہ "پھر انجام کار وہ ان لوگوں میں سے ہوا جن کا خاتمہ ایمان پر ہوا۔ اس لئے کہ ایمان پر خاتمہ طاعات سے انتفاع کیلئے شرط ہے۔ یا یہ کہ بیان کرنے میں تراخی ہے۔ گویا یہ کہا گیا ہے کہ "تم یہ یاد رکھو کہ وہ ان لوگوں میں سے ہو جو ایمان لائے۔۔۔" [۲۷]

ان تاویلات سے ہٹ کر جب ہم حرف 'ثم' کا مطالعہ قرآنی سیاق میں کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ قرآن جب اقتحام عقبہ (گھاٹی پار کرنے) کے مراحل کو جنھیں ایک انسان کو طے کرنا چاہیے، ترتیب وار بیان کرتا ہے تو آزاد کرنے اور رحم و کرم کا برتاؤ کرنے کو ایمان سے پہلے دو اقدامات کے طور پر ذکر کرتا ہے۔ جو ایمان کے لئے لازم ہیں۔ اس طرح وہ کہتا ہے کہ اس شخص میں ایمان کی کوئی رمق نہیں جو اللہ کے بندوں کو غلام بنائے رہے یا سنگ دلی کے سبب فاقے کے دن رشتہ دار یتیم یا خاک نشیں مسکین کی بھوک کی پرواہ نہ کرے، ایسے شخص میں ایمان صادق کی کوئی گنجائش نہیں۔

حرف 'ثم' کے سمجھنے میں سورۂ ماعون اور سورۂ آل عمران کی آیتوں سے مدد ملتی ہے:

"اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝ (الماعون: ۱-۳)

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران: ۱۱۰)

ان آیتوں میں ایمان سے پہلے نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کا تذکرہ ہے۔

ان میں اس قسم کے احتراز کی ضرورت نہیں کہ "ایمان طاعات کی صحت کیلئے شرط ہے" اس لئے کہ یہ تو اصل عقیدہ ہے۔ بلکہ دراصل احتراز اس گمان سے ہے کہ ایمان مجاہدہ، جود و سخا اور ایثار سے بے نیاز کر دیتا ہے اور یہ کہ عبادات کی ادائیگی سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری اور صبر، حق اور رحم کی باہم تلقین معاف ہو جاتی ہے۔

'و' 'او' کے معنی میں:

سورۂ نساء کی آیت ہے:

فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ (۳)

یہاں مفسرین اور اہلِ لغت نے سمجھ لیا کہ 'و' کے ذریعے عطف سے حاصل جمع کا مفہوم نکلتا ہے یعنی نو عورتیں اسی لئے انھیں یہ کہنا پڑا کہ اس آیت میں 'و' 'اُو' کے قائم مقام ہے، ابنِ ہشام کہتے ہیں:

"ایسا لغت میں معروف نہیں ہے۔ یہ صرف بعض ضعیف اہل لغت اور مفسرین کا قول ہے"

پھر انھوں نے "الرسالۃ المعربۃ عن شرف الاعراب" سے ابوطاہر حمزہ بن الحسین اصفہانی کا کا کلام نقل کیا ہے:

"سورۂ نساء کی آیت میں یہ کہنا کہ 'و' 'اُو' کے معنی میں ہے۔ صحیح نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ اعداد کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جس میں اعداد کو آپس میں جوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ اصول اعداد ہوتے ہیں[۲۸] جیسے:

فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ (البقرہ: ۱۹۶)

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً (الاعراف: ۱۴۲)

لیکن جب ثُلاث اور خُماس کہتے ہیں تو ان سے مراد آٹھ نہیں لیتے اور انھیں اس طرح نہیں جوڑتے جس طرح کہ مذکورہ بالا آیت "فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ" میں جوڑتے ہیں۔

ہیں سورۂ نساء کی اس آیت کو سمجھنے میں سورۂ فاطر اور سورۂ سبا کی مندرجہ ذیل آیات سے بھی مدد ملتی ہے :

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ؕ" (فاطر-۱)

"قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى" (سبا-۴۶)

اس سیاق سے ہم 'و' کے بیانی نکتہ کا ادراک کر سکتے ہیں۔ پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے سب کے سب دو دو یا تین تین یا چار چار پر والے نہیں ہیں۔ بلکہ ان میں سے کچھ دو دو پر والے ہیں کچھ تین پر والے اور کچھ چار پر والے۔ اسی طرح سورۂ سبا کی آیت میں مشرکین مکہ کو اختیار دیا گیا ہے کہ اللہ کے لئے چاہیں تو دو دو کر کے کھڑے ہوں یا تنہا تنہا کھڑے ہوں اگر یہ کہا جاتا "مثنی او فرادی" تو اس سے لازم آتا کہ سب کے سب یا تو دو دو کر کے کھڑے ہوں یا تنہا تنہا کھڑے ہوں۔

ان مثالوں کی روشنی میں ہم دیکھتے ہیں کہ سورۂ نساء کی آیت میں 'و' کو 'او' کے قائم مقام ماننے سے نہ صرف یہ کہ سیاق درست نہیں ہوتا بلکہ معنی میں بھی خلل پڑتا ہے۔ اس لئے کہ 'او' کے ذریعے تعبیر کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ ان کو اختیار دے دیا گیا ہے کہ چاہیں دو سے نکاح کریں یا تین سے یا چار سے۔ چنانچہ جو دو سے نکاح کریں ان کے لئے تین یا چار سے نکاح کرنا جائز نہ ہوگا اور آیت سے مستفاد حکم یہ نہیں بلکہ آیت سے سمجھ میں آنے والا حکم یہ ہے کہ وہ دو یا تین یا چار عورتوں سے نکاح کر سکتے ہیں۔ چار سے زیادہ عورتوں سے نکاح جائز نہیں۔

وہ شخص عربی زبان کے اسرار سے ناواقف ہے جو مثنی وثلاث ورباع اور اثنان وثلاث واربع میں فرق نہیں کرتا۔ حالانکہ اعداد کو صرف اسی وقت جمع کیا جاتا ہے جب وہ اپنی اصل پر ہوں۔ لیکن جب وہ معدول ہو جائیں تو انھیں جمع نہیں کیا جاتا۔

اسی طرح وہ شخص بھی عربی زبان کے اسرار سے نابلد ہے جو مثنی وثلاث ورباع اور مثنی او ثلاث او رباع میں فرق نہیں کرتا۔ مثنی وثلاث ورباع سے تعداد کی اباحت معلوم ہو رہی ہے کہ آدمی اپنے حالات کے مطابق دو یا تین یا چار عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے جبکہ مثنی او ثلاث او رباع سے صرف اختیار کا اشارہ ملتا ہے کہ وہ

یا تو دو سے یا تین سے یا چار عورتوں سے نکاح کرے۔

حواشی

۱ ابن ہشام، مغنی اللبیب عن کتب الاعاریب، طبع الجمالیہ، قاہرہ ۱۳۲۹ھ ۹۱/۱

۲ زمخشری، الکشاف عن حقائق التنزیل، دار المعرفۃ، بیروت (بدون تاریخ) ۱۴۱/۴
نیز ابن ہشام ۹۱/۱

۳ سیبویہ نے 'ب' کے صرف الصاق کے معنی بتلاتے ہیں، البتہ ابن ہشام نے اس کے چودہ معانی گناتے ہوئے سب سے پہلے الصاق' کو بیان کیا ہے اور آخری معنی تاکید بتلایا ہے اور لکھا ہے کہ: "کہا جاتا ہے کہ یہ معنی اس سے جدا نہیں ہوتا" ابن ہشام ۹۱/۱

۴ ابن ہشام ۱۵۵/۲ ۵ ایضاً

۶ ابن جریر، تفسیر طبری، الطبعۃ المیمنیۃ، مصر (بدون تاریخ) ۷۷/۲

۷ زمخشری، الکشاف، مطبوعہ کلکتہ، ۱۲۶/۱

۸ ابو حیان، البحر المحیط، مصر ۱۳۲۸ھ ۳۶/۲

۹ الطبری ۸۲/۲ ۱۰ ابن کثیر، تفسیر ابن کثیر، طبع المنار (بدون تاریخ) ۴۰۵/۱

۱۱ الکشاف ۱۲۶/۱ ۱۲ الطبری ۷۷/۲ ۱۳ البحر المحیط ۳۶/۲

۱۴ تفسیر البغوی برحاشیہ ابن کثیر، ۴۰۲/۱

۱۵ عبداللہ بن احمد بن قدامۃ المقدسی، المقنع، دار الکتاب العلمیۃ، بیروت ۱۹۷۹ء ص ۶۴

۱۶ الطبری ۷۸/۲ ۱۷ الکشاف ۱۲۶/۱ ۱۸ الطبری ۱۰۰/۱۰

۱۹ الکشاف ۱۵۴/۱ ۲۰ ابن ہشام ۱۶۳/۲

۲۱ ابو ہلال العسکری، الفروق اللغویۃ طبع الحلبی ص ۱۳ ۲۲ ایضاً ۲۳ ابن ہشام ۶۵۶/۲

۲۴ الطبری ۱۷۳/۳۰ ۲۵ الکشاف ۲۳۶/۴ رازی، تفسیر کبیر ۴۹۱/۸

۲۶ الکشاف ۲۵۶/۴ ۲۷ ابو حیان ۴۰۴/۸

۲۸ ابن ہشام ۶۵۳/۲-۶۵۴